تخاطب

حسین سحر

تخاطب

غزلیں

حسین سحر

کتاب نگر، حسن آرکیڈ، ملتان

ضابطہ

(جملہ حقوق محفوظ)

اشاعتِ اول	....	جنوری 1990ء
ناشر	....	کتاب نگر حسن آرکیڈ ملتان چھاؤنی
طابع	....	رُوحانی آرٹ پریس ملتان
سرورق	....	نظامی
کمپوزنگ	....	فیاض احمد
قیمت	....	ساٹھ روپے

انتساب

اپنی شریکِ حیات کے نام

پیش حرف

حُسین سحؔر کو پڑھتے ہوئے مَیں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ وہ نئے انداز کی تازہ اور توانا غزل ہی نہیں کہہ رہے بلکہ اس صنفِ ادب میں تخلیق کاری کرتے کرتے اس مقام پر بھی پہنچ گئے ہیں جہاں شاعر اپنا ذاتی تشخص قائم کرنا ضروری تصور نہیں کرتا بلکہ اس کے جذبے کی تطہیر جب شعر کا قالب اختیار کر لیتی ہے تو وہ جذباتی اور روحانی طور پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس نے اظہار مکمل کر لیا ہے۔ اور شاعر تخلیق کے بطون میں سما گیا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے بچہ پیدا ہو تو ماں باپ طمانیت محسوس کرتے ہیں کہ اب ان کی ذاتی شناخت مٹ بھی جائے تو ان کا سلسلۂ نسب ختم نہیں ہوگا۔ حسین سحؔر کی غزل بھی ان کے سلسلۂ نسب کو آگے بڑھانے والی غزل ہے۔ یہ ایسی غزل ہے جو پہلے اپنا تعارف خود کراتی ہے اور جب دل میں اتر جاتی ہے تو پڑھنے والا یہ جاننے کے لیے بیتاب ہو جاتا ہے کہ اس غزل کا خالق کون ہے؟

یہ مختصر سی تمہید مَیں نے اس لیے باندھی ہے کہ نئی غزل میں ایک امتیازی حیثیت رکھنے کے باوجود حسین سحؔر بہت زیادہ مشہور غزل نگار نہیں، بڑے شہر کا نقاد جب تعلقاتِ عامہ کا مدار وسیع کرنے کے لئے غزل گو شاعروں کی ایک لمبی کھتاونی بناتا ہے تو نثار اکبر آبادی پر پہنچ کر اس کا سانس پھول جاتا ہے اور پھر تنقید کا فرض کفایہ ادا کرتے کرتے وہ بھول جاتا ہے کہ اچھی غزل کراچی، لاہور، اسلام آباد اور پشاور ہی میں نہیں لکھی جا رہی بلکہ اس کو تازگی اور توانائی عطا کرنے والے ملتان، کبیر والہ، ساہیوال، مرید کے، فاروق آباد، بھکر، کلور کوٹ، خانیوال، وہاڑی اور پنوکی میں آباد ہیں۔ اور ایسی غزل لکھ رہے ہیں جس کے لئے لوگ چشم بر آواز رہتے ہیں۔ یہ غزل لاہور کے ممتاز ادبی رسائل میں دیر سے چھپتی ہے لیکن اس کی خوشبو اشاعت سے پہلے ہی دیوارِ چمن عبور کر جاتی ہے اور بعض اوقات تو ثقہ غزل گو مفصلات سے آئی ہوئی نئی زمین اور نئی بحر میں اپنی غزل لکھ کر مشاعرے میں بھی پڑھ دیتے ہیں اور حسین سحؔر جیسے شاعر حدِ ادب سے یہ بات بھی نہیں کہہ سکتے کہ خوشہ چینی ان کے خرمن ہی سے کر لی گئی ہے۔

حُسین سحؔر ملتان کے ایسے ہی شاعر ہیں جو اخبار، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی ضرورت پوری کرنے کے لئے غزل نہیں کہتے۔ شعر کہنا ان کی داخلی اور فطری ضرورت ہے۔ یہ بوئے سحر کا مست بلاوا ہے جس کی صدا پر حسین سحؔر کے جذبات کا قافلۂ نوبہار چل پڑتا ہے اور جب ہمارا دل موسیقی کے نرم لہرے میں تیرنے لگتا ہے اور خوشبو محیطِ جان ہو جاتی ہے تو حسین سحؔر ہمیں نظر نہیں آتے ان کی شاعری کا مینی فیسٹو جو ان کی زندگی اور فن سے ماخوذ ہو کر ہمارے سامنے آ گیا ہے وہ کچھ یوں ہے:

کس نے دیکھی ہے لبوں کی خوشبو؟
کون سُنتا ہے نظر کی آہٹ؟

اور اس سے ہی خیال آتا ہے کہ حُسین سحؔر کے ہاں خود کو نمایاں کرنے یا اپنی ذات کو مرکزِ کائنات بنانے کا مفہوم موجود نہیں اور وہ اپنے داخل میں موجزن رہنے کے آرزومند ہیں۔ حسین سحؔر اپنی خواہشات کا اسیر بن جانے کے بجائے ایسے حواس پر غالب آ جانے کی سعی کرتے ہیں جن سے خواہش پیدا ہوتی ہیں اور شاعری سے عبادت کا عنصر معدوم ہو جاتا ہے۔ حُسین سحؔر نے بات استعارے میں کہی ہے لیکن دیکھئے وہ چکاچوند روشنی سے کیا خوف محسوس کرتے ہیں:

شام ہوتے ہی کہاں ڈوبے گا　　صبح سے سوچ رہا ہے سورج

جب دھوپ کی تلوار چمکتی ہے سروں پر　　ہر رنگ بکھر جاتا ہے مرجاتی ہے خوشبو

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حُسین سحؔر نے ظلمت اور تاریکی کو قبول کیا ہے یا اس کی تپسیا کی ہے۔ حسین سحؔر جس روشنی سے خائف ہیں وہ جسم و جاں کو جُھلسا دینے اور آنکھوں کو خیرہ کر ڈالنے والی روشنی ہے۔ صبحِ صادق سے قبل اندھیرے کی کوکھ سے پیدا ہونے والی ملگجی روشنی یا شام کی تیرگی سے پہلے ستارے سے بیدار ہونے والی روشنی کی مہین سی لکیر تو حسین سحؔر کو لطافت ہی نہیں قوتِ گویائی بھی عطا کرتی ہے۔ وقت کے یہ دونوں قطعے ایسے ہیں جب شور مدھم پڑ جاتا ہے اور سکوت سخن جوئی پر آمادہ ہوتا ہے۔ میرا جی نے سچی شاعری کو انہی لمحات کی زائیدہ قرار دیا ہے۔ اس وقت شاعر اپنے اندر کی آواز سُنتا ہے۔ وہ فطرت کے ساتھ ہم کلام ہوتا ہے اور اس کا خیال لو دینے لگتا ہے۔ ایسے لمحات میں حسین سحؔر پر شاعری کی دیوی مہربان ہوتی ہے اور وہ اپنی خلاقی کا مظاہرہ اپنے مخصوص اسلوب میں کرتے ہیں۔

تیرے خیال کی مشعل جلے اگر دل میں　　تو اس اندھیرے مکاں میں بھی روشنی آئے

شام کی تیرگی میں ایک ستارہ چمکا　　اجنبی شہر میں یہ کس نے پکارا مجھ کو

حُسین سحؔر کی غزل پڑھتے ہوئے مجھے یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ وہ تاریکی اور روشنی، رات اور دن کے سنگم پر کھڑے ہیں اور دو مختلف دنیاؤں کا نظارہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ ان کے ہاں جو خوف پیدا ہوتا ہے اس نے حبس کی کیفیت کو سطح پر اُبھارا ہے لیکن جب خوف چھٹ جاتا ہے تو کشادگی کا احساس ہوتا ہے۔ فضا کھل جاتی ہے، محدود تناظر کو لامحدودیت مل جاتی ہے۔ دھندلے نقوش داخلی قوتِ گویائی سے فیضیاب ہو جاتے ہیں اس ضمن میں پہلے خارج سے جمع کی ہوئی چند حقیقتیں دیکھئے جو شاعر کو گراں بار کر رہیں ہیں۔

دھواں اگلتی ہوئی چمنیاں یہ کہتی ہیں　　حیات روز سلگتی ہے کارخانوں میں

آنکھ تو بے منظری کے خوف سے پتھرا گئی　　بے یقینی کی خزاں میں دل بھی مرجھانے لگا

شہروں کا بھی مستقبل محفوظ نہیں　　ہر اجڑی ویراں بستی کچھ کہتی ہے

گرم جوشی تھی کل، سرد مہری ہے اب　　لوگ موسم کی صورت بدلنے لگے

اب کے چاروں سمت میں یوں برسا ہے تنہائی کا زہر　　شہر بھی ویراں نظر آیا مرے گھر کی طرح

اس قسم کے اشعار میں یوں لگتا ہے کہ حسین سحؔر کو زمانے کی نوکِ خار مسلسل کچوکے لگا رہی ہے لیکن اس لمحے کو دوام حاصل نہیں۔ جونہی یہ لمحہ گزر جاتا ہے حسین سحؔر کے اندر کائنات روشن ہو جاتی ہے اور وہ شاعری میں خود کلامی کرنے لگتے ہیں۔ تو پھول کی طرح لطیف اور معطر محسوس ہوتے ہیں اور صاف نظر آتا ہے کہ اب وہ خارج کی منفی قوتوں کا مقابلہ جواں مردی اور تنومندی سے کر رہے ہیں اور انہوں نے اس مقابلے کے لئے اپنے ماضی اور ماضی کی حسین یادوں سے بے پناہ قوت حاصل کر لی ہے۔

محرومیوں کی دھوپ کی پروا نہیں مجھے　　رقصاں ہیں تیری یاد کے سائے خیال میں

مَیں وہ ابرِ رواں ہوں کہ تیری زمیں کیلئے　　کتنے صحراؤں کی تشنگی چھوڑ آیا ہوں مَیں

ذہن جب تاریک ہو جائیں مشینوں کے طفیل　　جذبِ دل کی روشنی کو عام کرنا چاہیئے

پھیلی ہے کچھ اس طرح دھنک تیرے بدن کی　　رنگوں سے چمک اُٹھا ہے آنگن مرے گھر کا

اس کے چہرے کے شفاف آئینے میں　　خوشبوؤں کا عکس دکھائی دیتا ہے

گوشے گوشے میں ہے رنگا رنگ خوابوں کی دھنک
ذہن بھی اس کے خیالوں کا عجائب گھر نہ ہو

عجب نظارہ دکھائی دیا فضاؤں میں　　زمین طلوع ہوئی چاند کے خلاؤں میں

اس قسم کے اشعار پڑھ کر یہ احساس نہیں ہوتا کہ حُسین سحؔر نے اِک موجِ ہوا پیچاں کو دیکھ لیا ہے اور اب انہیں میر تقی میؔر کے انداز میں زنجیر نظر آنے لگتی ہے۔ اس کے برعکس میرا اندازہ ہے کہ خارج کے جبر سے آزاد ہونے، معاشرے کی بند فضا سے نکلنے اور مشینوں کی میکانکیت سے گلو خلاصی پانے کے بعد جب وہ سیرِ لامکاں کے لئے نکل جاتے

ہیں تو ایک دائمی مسرت سے ہم کنار ہو جاتے ہیں۔ حُسین سحؔر کی غزل نے چونکہ صحرا کی کھلی فضا میں پرورش پائی ہے۔ اس لئے ان کی تمثالوں میں بھی وسعت اور تحرک کی فراوانی ہے۔ ابرِ رواں، آوارہ بگولے، آواز کی کرن، ظلمتِ شب، چراغِ صدا، ریگِ دل پر یادوں کے نشاں جیسی ترکیبوں کو پیشِ نظر رکھیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ حسین سحؔر نے ایک ایسی چیز کو جو ساکن ہے دوسری ایسی چیز کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے جو تحرک کی مظہر ہے اور جب اس ترکیب سے جو خیال غزل کے شعر سے طلوع ہوتا ہے وہ ٹکڑۂ ابر کی طرح رواں اور پرفشاں نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر حسین سحؔر شمعِ آرزو لے کر چلیں تو درد و غم کا اندھیرا سفر کرنے لگتا ہے۔ شدتِ احساس بڑھے تو پتھر کا خون کدال پر تیرنے لگتا ہے۔ چہرے کے شفاف آئینے میں عکس مجسم نہیں ہوتا بلکہ خوشبو کی طرح فضا میں پھیل جاتا ہے اور انہیں محبسِ دل سے رہائی ملے تو وہ زلفوں کی گھٹا بن جانے کی تمنا کرتے ہیں۔ حسین سحؔر کی غزل میں جب اس قسم کے موضوعات آتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین کے ساتھ اپنا ناتا قائم رکھتے ہوئے پرواز کے آرزومند بھی ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے بگولوں کا ہم سفر بننے کی آرزو نہیں کی بلکہ اپنی راہ خود متعین کی ہے اور جس نگر سے گزرے ہیں اسی کو اپنا گھر بنا لیا ہے۔

جدھر سے گزریں، جہاں جائیں سب نگر اُن کے
مسافر اپنی کوئی سرزمیں نہیں رکھتے

مَیں نے عرض کیا ہے کہ حسین سحؔر کی شاعری ہمیں دو مختلف دنیاؤں کا نظارہ کراتی ہے۔ اس قسم کے سنگم پر حیرت بھی پیدا ہوتی ہے اور تجسس کا جذبہ بھی بیدار ہوتا ہے۔ زندگی کبھی سوال بن کر سامنے آتی ہے اور کبھی شاعر کا تجربہ ہی اس کا جواب بن جاتا ہے۔ حسین سحؔر کی غزل میں یہ دونوں صورتیں بے حد دلآویز انداز میں اُبھری ہیں یعنی کبھی وہ اپنی حیرت کو سوالیہ نشان بنا دیتے ہیں۔

اِک کرن آواز کی ڈوبی تھی دشتِ شام میں
شہر کے سارے دریچے بے صدا کیوں ہو گئے؟

یہ آئنہ مرے پہلو میں کیوں چمکتا ہے؟ — دیارِ سنگ میں رہ رہ کے سوچتا ہوں مَیں
یہ خاک اُڑاتے ہوئے آوارہ بگولے — مجھ کو میری منزل کا پتہ کیوں نہیں دیتے؟
گر اس کا چہرہ ہے شفاف آئینے کی طرح — تو میرا عکس مجھے کیوں نظر نہیں آتا؟
جو میرے رگ و پے میں سلگتی ہے مسلسل — اُس آگ کو کس نام سے تعبیر کیا جائے؟

اور کبھی اس قسم کے سوالات حسین سحؔر نے خود اپنے آپ سے کئے ہیں تو ان کا جواب بھی فراہم کیا ہے۔ ان کے مندرجہ ذیل شعر میں ان کے اس طرزِ عمل کی طرف واضح اشارہ موجود ہے۔

تمام عمر تخاطب مرا مجھی سے رہا
سوال مَیں نے کیے ہیں جواب میرے ہیں

حُسین سحؔر کے سوالات اضطراب آسا ہیں لیکن ان کے سوالات میں حرص و ہوس کا پرتو نظر نہیں آتا۔ وہ نفسِ مطمئنہ رکھنے والے انسان ہیں اور زندگی کو طمانیت آمیز نظروں سے دیکھتے ہیں۔

روح کے زخموں کی شادابی کہاں ہے مستقل؟
ایک دن یہ لہلہاتی فصل بھی کٹ جائے گی
صحرا کی سمت جایئے کیوں شہر چھوڑ کر؟
ویرانیوں کی دل کے نگر میں کمی نہیں

دلچسپ بات یہ ہے کہ حُسین سحؔر نے داخلی مسرت اور قلبی طمانیت حاصل کرنے کے لئے آرزوؤں کی جگمگاتی ہوئی کہکشاں مرتب نہیں کی۔ ان کی اُمیدیں ایسی نہیں ہیں کہ

ٹوٹیں تو پھر پیدا ہی نہ ہوں۔ انہوں نے تمنا کا دوسرا قدم اٹھانے اور عرش سے پرے ایک اور مقام حاصل کرنے کی خواہش بھی نہیں کی۔ ایک قانع انسان کی طرح انہوں نے چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو زندگی کا حاصل قرار دیا ہے اور بحرِ حیات میں تنکے کی طرح بہنے کی تمنا کی ہے۔ حسین سحرؔ کا جہانِ آرزو ونظر کو خیرہ نہیں کرتا بلکہ دل پر شبنم سی بکھیر دیتا ہے اور یہ رویہ ایک ایسے عام آدمی کا ہے جو عظیم انسان کہلانا پسند نہیں کرتا اور صحرا کی ریت پر ننگے پاؤں چلنے میں مُسرت محسوس کرتا ہے۔ حُسین سحرؔ کی سادہ، معصوم آرزوؤں کی ایک جھلک ان اشعار میں دیکھئے:

محبسِ دل سے رہا ہو جاؤں   مَیں ترے لب سے ادا ہو جاؤں
تشنگی یوں نہ بجھے گی ہرگز   تیری زلفوں کی گھٹا ہو جاؤں

اب تو دریا میں اُتر آیا ہوں
چاہے جس سمت بہا لے جائے

خودبخود پاؤں رُکے جاتے ہیں   یہی شاید ترا رستہ ہو گا
اسی اُمید پہ کب سے ہوں چشم برآواز   سنائی دیتا ہے جو کچھ دکھائی بھی دے گا

آ ہی جائے گا سکوں پر یہ لہو کا دریا
درد سیلاب کی مانند گزر جائے گا

حسین سحرؔ کی غزلیں ہمارے لئے صرف شاعری پیش نہیں کرتیں یہ اس شاعر کو بھی منکشف کرتی ہیں جس کی شاعری اور شخصیت میں دوئی نہیں ہے۔ ان کی غزل اپنا ایک علیحدہ ''بلڈ گروپ'' رکھتی ہے۔ چنانچہ کئی لوگ جب ان کی وضع کردہ زمینوں میں شعر آزمائی کرتے ہیں تو صاف نظر آجاتا ہے کہ انہوں نے حسین سحرؔ کے اُترے ہوئے کپڑے پہن لئے ہیں۔ بلاشبہ حسین سحرؔ نے شہرت کی خلعتیں عطا کرنے والے درباروں تک رسائی حاصل نہیں کی کیونکہ یہ ان کے مزاج کے خلاف ہے۔ اس کے باوجود ان کی غزل نے اس دور کی فیشنی غزل سے الگ اپنا مابہ الامتیاز پیدا کیا ہے۔ پچھلے دنوں مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ایک ہندوستانی نقاد نے اپنے ایک مقالے میں اس دور کی غزل کے چند نمائندہ اشعار اقتباس کیے تو اس کڑے انتخاب میں حسین سحرؔ کے تین اشعار موجود تھے لیکن ان کے اپنے وطن میں منتخب اُردو غزل کا ایک ضخیم مجموعہ چھپا تو حسین سحرؔ کو اس میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ اگلے روز حسین سحرؔ اس ضخیم انتخاب کے مُرتب سے ''اہلِ قلم'' کے نئے پرچے کے لئے غزل منگوا رہے تھے تو انہوں نے مجھے اپنا یہ شعر سنایا:

ہم اسے یاد کیے جاتے ہیں
جس کی عادت ہے بھلائے رکھنا

اور پھر حسین سحرؔ بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ان کا قہقہہ میرے ذہن میں اب تک گونج رہا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید

۱۷۲-ستلج بلاک، اقبال ٹاؤن لاہور

تخاطب

بُجھتا ہوا دیا یہ سزا دے گیا مجھے
مَیں شعلۂ جنوں تھا ہوا دے گیا مجھے

رنگوں میں جیسے چاند کا پیکر بکھر گیا
پانی میں اس کا عکس مزا دے گیا مجھے

مَیں لہلہاتی شاخ کو سمجھا تھا زندگی
پتا گرا تو درسِ فنا دے گیا مجھے

خوشبو کا ایک نرم سا جھونکا بہار میں
گزرے ہوئے دنوں کی صدا دے گیا مجھے

سورج کی چند جاگتی کرنوں کا قافلہ
خوابیدہ منزلوں کا پتا دے گیا مجھے

میرے لئے تو سانس بھی لینا محال ہے
یہ کون زندگی کی دُعا دے گیا مجھے؟

مَیں خامشی کا پیکرِ بے رنگ تھا سحرؔ
اِک شخص بولنے کی ادا دے گیا مجھے

گنبدِ شب کا کوئی دَر وا نظر آتا نہیں
آسماں پر ایک بھی تارا نظر آتا نہیں

یوں تو ہر جانب نظر آتے ہیں چہروں کے ہجوم
ڈھونڈتا ہوں جس کو وہ چہرا نظر آتا نہیں

رقص کرتے ہیں بگولے ہی بگولے چار سُو
خاک وہ اُڑنے لگی صحرا نظر آتا نہیں

ریت کی لہریں سی اٹھتی ہیں کنارے کی طرف
تشنگی اتنی بڑھی دریا نظر آتا نہیں

اس قدر خوفِ سفر میں لوگ ہیں اُلجھے ہوئے
منزلیں ہیں سامنے رستا نظر آتا نہیں

کس کو جا کر ہم سنائیں اپنے دل کا ماجرا
ایک بھی اس شہر میں اپنا نظر آتا نہیں

فیصلہ مشکل بہت ہے اس اندھیرے میں سحر
کیا نظر آتا ہے مجھ کو کیا نظر آتا نہیں

حصارِ چشم میں آنسو کہیں نہیں رکھتے
ہم اس مکان میں کوئی مکیں نہیں رکھتے

تخاطب

بس ایک در ہے ہماری عقیدتوں کا امیں
ہر آستاں پہ ہم اپنی جبیں نہیں رکھتے

جہاں بھی جائیں جدھر جائیں سب نگر اُن کے
مسافر اپنی کوئی سرزمیں نہیں رکھتے

کمال یہ ہے کہ قاتل کھڑے ہیں تیغ بکف
لہو میں ڈوبی ہوئی آستیں نہیں رکھتے

ہمارا خاک سے رشتہ ہو کس طرح محکم؟
ہم آسماں کے بھی نیچے زمیں نہیں رکھتے

بصارتوں کے لئے چاہیے بصیرت بھ ی
یہی شعور مرے نکتہ چیں نہیں رکھتے

وہ احترام ہے حاصل ترے فقیروں کو
جو احترام کہ مسند نشیں نہیں رکھتے

بصارتوں کے لئے چاہیئے بصیرت بھی
یہی شعور مرے نکتہ چیں نہیں رکھتے

جو اس کے دل میں اُتر جائے نغمگی بن کر
صدا ہم ایسی سحر دل نشیں نہیں رکھتے

گونج اٹھی جو سفر کی آہٹ
دب گئی شور میں گھر کی آہٹ

روز آتی ہے دیارِ دل میں
تیری یادوں کے سفر کی آہٹ

اس قدر عام ہوا حبس ہوا
چُپ ہے خوشبو کے نگر کی آہٹ

سُن رہا ہوں مَیں سکوتِ شب میں
طائرِ فکر کے پر کی آہٹ

مدتوں بعد تری یاد آئی
دشت میں آئی ہے گھر کی آہٹ

کس نے دیکھی ہے لبوں کی خوشبو؟
کون سُنتا ہے نظر کی آہٹ؟

ہوئیں مسدود وفا کی راہیں
اب کہاں آئے اُدھر کی آہٹ؟

ہمہ تن گوش ہے شب کا پیکر
آنے والی ہے سحر کی آہٹ

دشتِ احساس کے رخشندہ سرابوں جیسی
تیری آنکھوں میں چمک ہے مرے خوابوں جیسی

یہ الگ بات وہ ہے بوئے وفا سے خالی
اس کے چہرے کی تو رنگت ہے گلابوں جیسی

اس کے سینے میں دھڑکتا ہے تو دل پتھر کا
جس کی رفتار میں نرمی ہے سحابوں جیسی

کوئی خوشبو نہ کوئی رنگ نہ کوئی نغمہ
وادیٔ ذہن کی حالت ہے خرابوں جیسی

دیکھ اے موجِ نفس! ٹھیس نہ لگ جائے کہیں
شیشۂ جاں میں نزاکت ہے حبابوں جیسی

ہے سحر خون مِرا میری رگوں میں رقصاں
درد میں پھر وہی لذت ہے شرابوں جیسی

پتھر کا اسے نقش بنا کیوں نہیں دیتے؟
اس دل کو دھڑکنے کی سزا کیوں نہیں دیتے؟

کیوں اب بھی سرِ لوح مرا نام ہے کندہ؟
مَیں حرفِ غلط ہوں تو مٹا کیوں نہیں دیتے؟

مَیں دھوپ کے صحرا میں بھٹکتا رہوں کب تک؟
سائے تری زلفوں کے صدا کیوں نہیں دیتے؟

گر پھول ہوں مَیں لمس ملے حُسن کا مجھ کو
کانٹا ہوں تو رستے سے ہٹا کیوں نہیں دیتے؟

یہ خاک اڑاتے ہوئے آوارہ بگولے
مجھ کو مری منزل کا پتہ کیوں نہیں دیتے؟

ہر سمت ہیں نفرت کے اندھیرے ہی اندھیرے
اک شمع محبت کی جلا کیوں نہیں دیتے؟

خوشبو کے یہ جھونکے ہیں جو ایوانِ سحر میں
کرنوں کو تبسم کی ضیاء کیوں نہیں دیتے؟

ریزہ ریزہ ہو کر ایسے بکھرے خواب
جیسے سب تھے آرزوؤں کے شیشے خواب

جن خوابوں کی کوئی بھی تعبیر نہیں
دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں ایسے خواب

ماضی کے اوراق شکستہ، پارینہ
مستقبل کے سارے خواب سنہرے خواب

چاہو تو یہ سودا ہے منظور مجھے
لے لو مجھ سے میرے دے دو اپنے خواب

مَیں یادوں کا بوجھ اٹھائے پھرتا ہوں
دن میرے بے چین مری راتیں بے خواب

ذروں کو بھی سورج کا ہمسر دیکھوں
دنیا بھر سے میرے خواب اچھوتے خواب

کیا رکھا ہے پاس مرے کیا رکھا ہے؟
خواب ہیں لیکن وہ بھی چند ادھورے خواب

جگمگ کرتے تاروں کی مانند سحر
اس کی آنکھوں میں بستے ہیں میرے خواب

شام تک ساتھ رہا ہے سورج
میرے ہمراہ جلا ہے سورج

چاند ہے جس کے بدن کا پرتو
اُس کے چہرے کی ضیاء ہے سورج

دل کی دھڑکن بھی ہے مدھم مدھم
کن اندھیروں میں گھرا ہے سورج

شام ہوتے ہی کہاں ڈوبے گا؟
صبح سے سوچ رہا ہے سورج

مرا ماحول اندھیروں کا جہاں
میری مُٹھی میں چھپا ہے سورج

تخاطب

جس کے دشتِ خزاں دیدہ میں
پھول بن بن کے کِھلا ہے سورج

مَیں علامت ہوں اُجالوں کی سحر
میرے ماتھے پہ لکھا ہے سورج

ہوا ہے جب بھی مرا سامنا ہواؤں سے
ملی ہے مجھے کو مری ہی صدا ہواؤں سے

مرے لہو کی تمازت نصیب ہے اس کو
بُجھے گا کیسے دیا درد کا ہواؤں سے؟

یہ اور بات کہ دیکھا نہیں تجھے اب تک
سُنا ہے مَیں نے ترا تذکرہ ہواؤں سے

تخاطب

رہے گا تازہ ہمیشہ یہ مہر و مہ کا سفر
کبھی رُکے گا نہ یہ قافلہ ہواؤں سے

چراغ بن کے فضائے جنوں میں روشن ہوں
ملا ہے مجھ کو نیا حوصلہ ہواؤں سے

لکھا ہے مَیں نے جو اِک نام ریت کے رُخ پر
سحر وہ کیسے مِٹے گا بھلا ہواؤں سے؟

کرن کرن کے درخشندہ باب میرے ہیں
تمام روشنیوں کے نصاب میرے ہیں

شبوں کے سبز جزیرے ہیں سب مری اقلیم
تمام جاگتی آنکھوں کے خواب میرے ہیں

مَیں ہوں تمام دھڑکتے دلوں کا شیدائی
یہ آبگینے یہ نازک حباب میرے ہیں

تمام عمر تخاطب مرا مجھی سے رہا
سوال مَیں نے کئے ہیں جواب میرے ہیں

خدائے دشت کی تقسیم پر مَیں راضی ہوں
کہ آب پارے ترے ہیں سراب میرے ہیں

نصیب آج ہیں کانٹے اگر تو کیا غم ہے
نئی رُتوں کے شگفتہ گلاب میرے ہیں

مَیں آفتاب کی مانند ہوں نقیبِ سحر
سیاہیوں پہ کبھی احتساب میرے ہیں

دیکھتے ہی دیکھتے نا آشنا کیوں ہو گئے؟
وہ جو نزدیکِ رگِ جاں تھے جُدا کیوں ہو گئے؟

خواب تھے تحلیل ہو کر رہ گئے کیوں آنکھ میں؟
آئینوں میں عکس تھے اُڑ کر ہوا کیوں ہو گئے؟

سوچتا ہوں قربتوں کا کیا یہی انجام تھا؟
زندگی کے رس بھرے لمحے سزا کیوں ہو گئے؟

جب سفر کی گرد چھٹ جائے تو پھر یہ سوچنا
ہم تمہارے راستے میں نقشِ پا کیوں ہو گئے؟

اِک کرن آواز کی ڈوبی تھی دشتِ شام میں
شہر کے سارے دریچے بےصدا کیوں ہو گئے؟

تخاطب

اس حقیقت سے ہے واقف میرے دشمن کا ضمیر
خود بخود لب میرے مصروفِ دُعا کیوں ہو گئے؟

وہ جو سائے کی طرح ہمراہ تھے اپنے سحر
حادثوں کی دھوپ میں ہم سے جُدا کیوں ہو گئے؟

زباں پر تلخیوں کے ذائقے بھی ساتھ رکھتا ہے
وہ ملتا ہے محبت سے گِلے بھی ساتھ رکھتا ہے

تضاد اس شخص کے قول و عمل میں ہے عجب ایسا
کہ ظلمت بانٹتا ہے اور دیئے بھی ساتھ رکھتا ہے

جہاں جاتا ہے میرا ذکر کرتا ہے وہ نفرت سے
یہ اس کی مہربانی ہے مجھے بھی ساتھ رکھتا ہے

وہ اپنے آپ کا نظارہ کرنے میں ہے محو اتنا
کہ اپنی حیرتوں کے آئینے بھی ساتھ رکھتا ہے

وہ مدت بعد جب ملتا ہے بے خوفی سے ملتا ہے
بچھڑ جانے کے لیکن وسوسے بھی ساتھ رکھتا ہے

ملاقاتوں میں اس کی قربتوں کی ہے عجب صورت
دلوں کے درمیاں کچھ فاصلے بھی ساتھ رکھتا ہے

سحرؔ یہ دل اُمید و بیم کے طوفاں میں کھویا ہے
یقیں کے ساتھ کچھ کچھ واہمے بھی ساتھ رکھتا ہے

کوئی لاکھ کہے تم ایسا مت کہنا
بھول کے بھی قطرے کو دریا مت کہنا

تخاطب

ذہن اگرچہ مان بھی لے اس کی باتیں
دل نہ کرے تسلیم تو اچھا مت کہنا

جس سے شب کی تاریکی کچھ اور بڑھے
اس جگنو کو صبح کا تارا مت کہنا

جو ہر وقت تمہاری یاد میں کھویا ہو
ایسے بزم آرا کو تنہا مت کہنا

مَیں تو غم کی دھوپ میں تنہا جلتا ہوں
اب تم خود کو میرا سایہ مت کہنا

اس کے حُسن کی یکتائی کہتی ہے سحرؔ
ہر چہرے کو اس کا چہرا مت کہنا

دھنک کی لوح پہ مرمر دکھائی دیتا ہے
تمہارے شہر کا منظر دکھائی دیتا ہے

وہ جس کو گرمیِ بازار کہہ رہے ہیں لوگ
مجھے تو حشر کا منظر دکھائی دیتا ہے

فلک سے سطحِ زمیں تک ہے چاند ہی روشن
جہاں بھی جاؤ یہی گھر دکھائی دیتا ہے

یہ کیسا شہر ہے خاموش موت کی صورت
ہر آدمی یہاں پتھر دکھائی دیتا ہے

قدم قدم پہ فصیلِ دیارِ خوشبو سے
ہوائے تند کا لشکر دکھائی دیتا ہے

اُبھرنے لگتے ہیں جب شب کے کوہسارِ سحر
تو روشنی کا سمندر دکھائی دیتا ہے

اب تک رہا نہاں جو صدائے خیال میں
ممکن نہیں کہ حُسن وہ آئے خیال میں

چھوتے ہی انگ انگ ہو جن کا دھواں دھواں
لپٹے ہیں ایسے جسم ردائے خیال میں

محرومیوں کی دھوپ کی پروا نہیں مجھے
رقصاں ہیں تیری یاد کے سائے خیال میں

رنگوں کے قافلے ہیں افق تا افق رواں
اڑتے ہیں کتنے عکس ہوائے خیال میں

بے نور تھے جو خواب کی ظلمات میں سحرؔ
روشن ہوئے وہ نقش ضیائے خیال میں

شہر کی گلیوں سے جب بھی ہم گزرے ہیں
خوشبو کی مانند فضا میں بکھرے ہیں

کتنے آنسو ضبطِ الم سے خشک ہوئے
کتنے چڑھتے دریا پل میں اترے ہیں

گلدانوں میں جب بھی تازہ پھول سجے
ذہن کی شاخ پہ سوکھے پتے اُبھرے ہیں

ربط اگر ہو، دوری کوئی چیز نہیں
سیپ کے موتی ابر کی آنکھ کے قطرے ہیں

جسموں کی بے داغ سجاوٹ پر مت جا
مَن کے میلے لوگ ہی تن کے ستھرے ہیں

چرخ کی نیلاہٹ سے فرش کے سبزے تک
سحرؔ دھنک کے رنگ ہی ہر سُو بکھرے ہیں

بے رنگ فضاؤں میں بکھر جاتی ہے خوشبو
وہ شخص جدھر جائے اُدھر جاتی ہے خوشبو

یہ فیض ہے اُس نقشِ کفِ پا کی مہک کا
ہر ذرے کے سینے میں اُتر جاتی ہے خوشبو

ممکن نہیں جس رہ سے شعاعوں کا گزر بھی
اس راہ سے بے خوف گزر جاتی ہے خوشبو

تخاطب

لرزاں ہے تری یاد بہت غم کے اثر سے
جب سرد ہوا آئے تو ڈر جاتی ہے خوشبو

گلشن میں جو خاک اڑتی ہے روتی ہیں ہوائیں
یہ سوچنا پڑتا ہے کدھر جاتی ہے خوشبو؟

جب دھوپ کی تلوار چمکتی ہے سروں پر
ہر رنگ بکھر جاتا ہے مر جاتی ہے خوشبو

اُس زلفِ معطر کے سحر لمس کو پا کر
پہلے سے بھی کچھ اور نکھر جاتی ہے خوشبو

ہے برگ برگ دُعا کو ذرا نمی آئے
ہوا چلے تو شگوفوں پہ تازگی آئے

اُفق پہ اُبھرے جو سورج کا چہرۂ تاباں
سسکتی ریت کے ذروں میں زندگی آئے

کبھی تو دل میں تری یاد کا چمن مہکے
اس آئنے میں بھی احساسِ چہرگی آئے

ترے خیال کی مشعل جلے اگر دل میں
تو اس اندھیرے مکاں میں بھی روشنی آئے

اسی اُمید پہ ہوں شہر شہر آوارہ
اسی طرح کبھی شاید تری گلی آئے

عجب نہیں کہ مری آتشیں صداؤں سے
کسی کے برف سے پیکر میں شعلگی آئی

سحر نظر کے دریچوں کو یونہی وا رکھنا
کسے خبر کبھی تازہ ہوا چلی آئے

برگِ تنہا ہوں اڑا لے جائے
جس طرف چاہے ہوا لے جائے

اب تو دریا میں اتر آیا ہوں
چاہے جس سمت بہا لے جائے

چل رہا ہوں کہ کبھی تو شاید
مجھ کو منزل پہ خدا لے جائے

روشنی کی ہو جسے بھی خواہش
وہ مرے دل کا دیا لے جائے

کب سے مَیں خود سے ہوں روٹھا روٹھا
کوئی مجھ کو بھی منا لے جائے

تخاطب

اے سحر منظرِ شب سے پہلے
کوئی آنکھوں کی ضیا لے جائے

شاخ سے پھول جو ٹوٹا ہو گا
میرے ہی دل کا چھناکا ہو گا

خودبخود پاؤں رکے جاتے ہیں
یہی شاید ترا رستا ہو گا

مری ہر سمت ہیں کتنے چہرے
کوئی مجھ سا بھی نہ تنہا ہو گا

کوئی شہکار جو تخلیق ہوا
ہُو بہُو تیرا سراپا ہو گا

کس قدر یاد کیا ہے ہم نے
کس قدر اُس نے بُھلایا ہو گا

در و دیوار سے اٹھتا ہے دھواں
کہیں شعلہ کوئی بھڑکا ہو گا

اِک نہ اِک دن تو کرن پھوٹے گی
اِک نہ اِک دن تو اُجالا ہو گا

جس نے یہ رتجگے بخشے ہیں سحر
وہ کوئی جاگتا لمحہ ہو گا

پیاس کی شدت دکھاتی ہے عجب نیرنگیاں
جگمگاتی ریت پر ہوتا ہے پانی کا گماں

تخاطب

دل پہ جو گزرے اب اظہار تک لے آیئے
کوئی سمجھا ہے سمجھے گا خموشی کی زباں

ڈوبتا جاتا ہے دل بے نور سورج کی طرح
پھیلتی جاتی ہیں ہر سو شام کی تاریکیاں

تازگی کا نام تک اپنے مقدر میں نہیں
ذات کے بے رنگ صحرا کا سفر ہے رائیگاں

شاخچوں کے سر بریدہ ہیں تو گُل مصلوب ہیں
صحنِ گلشن میں منایا جائے گا جشنِ خزاں

رنگ لائی ہے ہوائے غم کی آشفتہ سری
مٹ چکے ہیں ریگِ دل پر تیری یادوں کے نشاں

ہیں سحر برّاق مرمر کی طرح جن کے بدن
ان کے چہروں پہ لکھی ہے ظلمتوں کی داستاں

نازک سا التفاتِ صبا چاہیئے مجھے
مَیں پھول ہوں چمن کی ہوا چاہیے مجھے

تاجِ شہی نہ تختِ سلیماں کی ہے طلب
ٹوٹے ہوئے دلوں کی دُعا چاہیے مجھے

درپیش ہے شبوں کے طلسمات کا سفر
راہوں میں اِک چراغِ صدا چاہیئے مجھے

خوشبوئے گل کے راز سے ناآشنا ہوں مَیں
سنسان جنگلوں کی ہوا چاہیے مجھے

سر پر غم و اَلم کی کڑی دھوپ ہے سحرؔ
شب رنگ گیسوؤں کی گھٹا چاہیے مجھے

تخاطب

عجب نظارہ دکھائی دیا فضاؤں میں
زمیں طلوع ہوئی چاند کے خلاؤں میں

چمکتی دھوپ کے آثار کی خبر پا کر
ہیں پھول لپٹے ہوئے شبنمی رداؤں میں

یہاں تو اپنی ہی خوبی ہے ذات کی دشمن
سلگ رہے ہیں کئی پیڑ اپنی چھاؤں میں

مَیں سوچتا ہوں کہاں کھو گئی مری آواز؟
بس ایک شور سا ملتا ہے سب صداؤں میں

اُسی کا رنگ چمکتا ہے ہر کرن میں سحرؔ
وہ جس کی زلف کی مہکار ہے ہواؤں میں

کس نگر صبح کی روشنی چھوڑ آیا ہوں مَیں
اپنے بچپن کی سادہ دلی چھوڑ آیا ہوں مَیں

آ گہی کے سفر میں خدا جانے کس موڑ پر
اپنی چاہت کی دیوانگی چھوڑ آیا ہوں مَیں

میرے دم سے تھی آواز کی شعلگی چار سُو
اپنے پیچھے فقط خامشی چھوڑ آیا ہوں مَیں

مَیں وہ ابرِ رواں ہوں کہ تیری زمیں کے لئے
کتنے صحراؤں کی تشنگی چھوڑ آیا ہوں

بام و در جگمگاتے رہیں گے ہمیشہ سحر
شہر میں ایسی تابندگی چھوڑ آیا ہوں مَیں

معمورۂ زمیں سے صحرائے آسماں تک
ہے رہروِ طلب کا نقشِ قدم کہاں تک؟

سوچو تو ان کی یادیں ہر دم ہیں دل میں رقصاں
ڈھونڈو تو رفتگاں کا ملتا نہیں نشاں تک

یلغار کر رہی ہیں گو چار سُو ہوائیں
خاموش کیوں ہیں پھر بھی کشتی کے بادباں تک؟

بے نام خواہشیں ہیں دل میں کچھ ایسے روشن
یہ شمعیں بُجھ بھی جائیں اُٹھتا نہیں دُھواں تک

رنگوں کا قافلہ ہی شام و سحر رواں ہے
نورِ بہارِ گُل سے تاریکیٔ خزاں تک

سورج سفر میں ہے نہ ستارا سفر میں ہے
اپنا وجود اپنا ہی سایا سفر میں ہے

اِک روشنی ہے ذہن سے دل تک رواں دواں
گویا تمہارے درد کا دریا سفر میں ہے

چاروں طرف سلگتے بگولے ہیں رقص میں
محسوس ہو رہا ہے کہ صحرا سفر میں ہے

بہتر ہے ساتھ لے کے چلیں شمعِ آرزو
سُنتے ہیں درد و غم کا اندھیرا سفر میں ہے

اِک کاروانِ درد و الم ساتھ ہے سحرؔ
کہنے کو یوں تو دل مرا تنہا سفر میں ہے

تخاطب

رنگ و خوشبو کی نئی دنیا دکھائی دے مجھے
آنکھ جب کھولوں ترا چہرا دکھائی دے مجھے

وادیٔ دل میں چمک اٹھے تری یادوں کا چاند
اس اندھیرے میں کہیں رستا دکھائی دے مجھے

زیست کے لمبے سفر کی دھوپ کا کچھ غم نہیں
ابر سی زلفوں کا گر سایا دکھائی دے مجھے

وہ جو خلوت میں بھی اپنی ذات میں ہے انجمن
کاش محفل میں کبھی تنہا دکھائی دے مجھے

ہر طرف ہیں اجنبی ہی اجنبی چہرے سحرؔ
کوئی تو اس شہر میں اپنا دکھائی دے مجھے

تمام شہر ہے خاموش جاگتا ہوں مَیں
اندھیری رات میں جلتا ہوا دیا ہوں مَیں

کبھی تو کوئی سُنے گا مجھے توجہ سے
ہوا کے دوش پہ اڑتی ہوئی صدا ہوں مَیں

ہے میرے چاروں طرف اِک ہجوم چہروں کا
حصارِ ذات میں اس طرح کھو گیا ہوں مَیں

شکست و فتح سے ہوں بے نیاز مَیں یکسر
کسی کی جنگ ہے جو آج لڑ رہا ہوں مَیں

وفا کو شہرِ جفا میں تلاش کرتا ہوں
چراغ تیز ہوا میں جلا رہا ہوں مَیں

تخاطب

یہ آئنہ مرے پہلو میں کیوں چمکتا ہے؟
دیارِ سنگ میں رہ رہ کے سوچتا ہوں مَیں

کبھی ستارہ کبھی شعلہ ہوں کبھی شبنم
سمجھ میں کچھ نہیں آتا سحرؔ کہ کیا ہوں مَیں

جب بھی آنکھوں نے ترا نقشِ کفِ پا دیکھا
دل کے آئینے میں اِک عکس لرزتا دیکھا

ابر چھایا تو تری زلفِ سیہ یاد آئی
چاند نکلا تو ترا رنگ چمکتا دیکھا

یاد آئی تری آواز کی موجِ رقصاں
شام کے وقت جو بہتا ہوا دریا دیکھا

ہم ہی محرومِ تماشا ہیں جہاں میں ورنہ
دیکھنے والوں نے ہر سُو ترا جلوہ دیکھا

خاک سی اُڑنے لگی دل کے بیاباں میں سحر
شاخ پر جب بھی کوئی پھول مہکتا دیکھا

دلوں میں زہر لبوں پر شگفتگی دیکھی
یہ رسم ہم نے عجب تیرے شہر کی دیکھی

جو بزمِ شب میں بہت قہقہے لگاتے تھے
انہی کی آنکھ دمِ صبح شبنمی دیکھی

تجھے دلوں کی سیاہی کی کیا خبر ہو گی
تری نظر نے تو جسموں کی چاندنی دیکھی

تخاطب

نظر کو خیرہ کیا اس قدر شعاعوں نے
کہ ہم نے چاند کی رنگت بھی سرمئی دیکھی

وہیں خیال کی وادی مہک اٹھی ہے سحر
جہاں بھی پھول سے چہروں پہ تازگی دیکھی

یوں وقت کے احساس کو تسخیر کیا جائے
ہر لمحۂ سیّال کو زنجیر کیا جائے

سوچا ہے کہ اب دِل سے بُھلا کر تجھے دیکھیں
یہ نقش بھی اس لوح پہ تحریر کیا جائے

جو میرے رگ و پے میں سُلگتی ہے مسلسل
اس آگ کو کس نام سے تعبیر کیا جائے؟

دل وقفِ غم و درد ہو یا غرقِ مسرت
اس خاک کو جیسے بھی ہو اکسیر کیا جائے

تسخیرِ فلک کی بھی سحر ہوتی رہے گی
پہلے دلِ انسان کو تسخیر کیا جائے

عکسِ دل ہے کہاں چشمِ پُر آب ہیں؟
شہر کا شہر ڈوبا ہے سیلاب میں

یہ مرے شعلۂ غم کا اعجاز ہے
آگ ایسی تپش ہے جو برفاب میں

جو ترے جلوۂ رُخ سے منسوب ہے
روشنی ہے کہاں ایسی مہتاب میں؟

تخاطب

آج دیکھا انہیں خاک اوڑھے ہوئے
وہ بدن تھے جو ملبوس کمخواب میں

اب تو یاد اس کی ساحل نما ہے سحر
گھِر گئی کشتیٔ روح گرداب میں

یوں نظر آتا ہے غم دل میں اُتر جائے گا
وقت گزرے گا تو یہ زخم بھی بھر جائے گا

آ ہی جائے گا سکوں پہ یہ لہو کا دریا
درد سیلاب کی مانند گزر جائے گا

ذہن کی جھیل میں اُبھرا جو کنول یادوں کا
ہجر کی تیز ہواؤں میں بکھر جائے گا

کیا خبر تھی کہ ترے ہجر کا اک اک لمحہ
زہر بن کر مری رگ رگ میں اُتر جائے گا

کسی چہرے کا گلِ تازہ سرِ شامِ سحر
چاند نکلے گا تو کچھ اور نکھر جائے گا

شام کے زرد سائے جو ڈھلنے لگے
طائرِ فکر کے پَر نکلنے لگے

گرم جوشی تھی کل سرد مہری ہے اب
لوگ موسم کی صورت بدلنے لگے

پھر بہار آ گئی وادیٔ روح میں
چشمۂ دل سے پھر غم اُبلنے لگے

دور سے آ رہی ہے جرس کی صدا
قافلے رُک گئے تھے جو، چلنے لگے

سخت بے حس تھے جو پتھروں کی طرح
درد کی آگ میں اب پگھلنے لگے

پھر ضرورت پڑی دوستوں کی سحر
آستینوں میں پھر سانپ پلنے لگے

غمِ جہاں تو بہر گام تیرگی دے گا
ترا خیال مگر دل کو روشنی دے گا

مجھے یقیں ہے بچھڑ جائے گا وہ ملتے ہی
خوشی جو دی ہے زمانے نے رنج بھی دے گا

کبھی تو دل میں کوئی عکس روشنی بن کر
اس آئینے کو بھی پوشاکِ چہرگی دے گا

اسی اُمید پہ کب سے ہوں چشم بر آواز
سنائی دیتا ہے جو کچھ دکھائی بھی دے گا

غموں کی دولتِ بے پایاں جس نے بخشی ہے
سحر کبھی تو مرے دل کو وہ خوشی دے گا

***

ہر رنگ میں وہ حُسنِ ادا کا امین ہے
جس زاویئے سے دیکھئے اس کو حسین ہے

تو آسماں پہ اڑتے ہوئے بادلوں کا عکس
میرا وجود درد کی بنجر زمین ہے

تخاطب

کچھ اور بھی سکون ہے دل کو ترے بغیر
تجھ سے ترا خیال زیادہ حسین ہے

انسانیت کا درد ہے سرمایۂ حیات
انسانیت ہی اہلِ محبت کا دین ہے

مَیں جس کی جستجو میں ہوں شام و سحر رواں
وہ شخص میرے گوشۂ دل میں مکین ہے

***

تیز ہوا کا شور سنائی دیتا ہے
غنچہ و گل کا حشر دکھائی دیتا ہے

اس کانٹے کی عظمت کا کیا اندازہ
رہرو کو جو آبلہ پائی دیتا ہے

تخاطب

اس کے چہرے کے شفاف آئینے میں
خوشبوؤں کا عکس دکھائی دیتا ہے

دل کو محفل آرائی بھی بخشے گا
جو مجھ کو ذوقِ تنہائی دیتا ہے

مجھ کو سحرؔ اپنی ہی ذات کے زنداں سے
دیکھتا ہوں اب کون رہائی دیتا ہے

ہر پھول پہ ہوتا ہے گماں آج شرر کا
آغاز ہے یہ طائرِ خوشبو کے سفر کا

پھیلی ہے کچھ اس طرح دھنک تیرے بدن کی
رنگوں سے چمک اٹھا ہے آنگن مرے گھر کا

شاخوں پہ جو سورج کا اثر یونہی رہے گا
سایہ بھی سلگتا ہوا دیکھو گے شجر کا

ہر رنگ ہے محفوظ مرے خانۂ دل میں
ہر نقش ہے قیدی مرے زندانِ نظر کا

احباب میں اظہارِ حقیقت سے حذر کر
کھل جائے نہ احوال ترے عیب و ہنر کا

دیکھا تو وہ اپنی ہی طرح خاک بسر تھا
شہرہ تھا سحرؔ یوں تو بہت چاند نگر کا

محبسِ دل سے رہا ہو جاؤں
مَیں ترے لب سے ادا ہو جاؤں

تیرا نقشِ کفِ پا ہوتے ہی
محورِ ارض و سما ہو جاؤں

تشنگی یوں نہ بُجھے گی ہرگز
تیری زلفوں کی گھٹا ہو جاؤں

اس خموشی کا ہے بس ایک علاج
مَیں ہی خود نغمہ سرا ہو جاؤں

ظلم کی تیرہ فضاؤں میں سحر
جلتے سورج کی ادا ہو جاؤں

ذرے سِسک رہے ہیں ظلمت کی انتہا پر
الزام آ نہ جائے خورشید کی ضیا پر

روحِ زمیں سکوں سے محروم ہو گئی ہے
شاید یہ دولتِ دل ہاتھ آئے اب خلا پر

اشکوں کی روشنی سے آہوں کی نغمگی سے
آباد ہو گیا ہے اِک شہر سا ہوا پر

سورج کے ساتھ دریا صورت بدل رہا ہے
کرنوں کی ہے حکومت موجوں کی ہر ادا پر

ہے تیرا عکس رقصاں آئینۂ سحر میں
ہوتا ہے تیرا دھوکا ہر رنگ ہر صدا پر

سورج کی روشنی کو فلک سے پکار کر
رنگوں کے پیرہن کو نہ یوں تار تار کر

مَیں آنے والا وقت ہوں پیشِ نگاہ رکھ
تیرے لئے رُکوں گا مِرا انتظار کر

تیری سرشت میں نہیں شعلوں سے دوستی
تُو خاک ہے تو خاک کے ذرّوں سے پیار کر

آواز کا بھی عکس بہت دلفریب ہے
دیکھا ہے ہم نہ شیشۂ دل میں اتار کر

تنہا ہی ہو سکے گا سحؔر ذات کا سفر
سایہ بھی اب تو اپنا سپردِ غبار کر

اگر شعاعوں کا دریا سراب جیسا ہے
تو جاگنے کا یہ منظر بھی خواب جیسا ہے

ہر ایک نقش کا مفہوم ڈھونڈتا ہوں مَیں
مری نظر میں وہ چہرہ کتاب جیسا ہے

کسی نے غور سے اس خاک کو نہیں دیکھا
ہر ایک ذرہ یہاں آفتاب جیسا ہے

حسین و تازہ خیالوں سے ذہن ہے خالی
یہ شہر بھی دلِ خانہ خراب جیسا ہے

سحؔر یہ کہتی ہے امکاں کی بیکراں وسعت
فلک کا گنبدِ بے در حباب جیسا ہے

رنگ بن کر شاخساروں میں اترنا چاہیئے
نکہتِ گل کی طرح ہر سو بکھرنا چاہیئے

سیر کو شادابیِ دشتِ نظر کافی نہیں
ہو سکے تو شہرِ دل سے بھی گزرنا چاہیئے

یہ بھی ممکن ہے کہ دل ہو جائے تجھ سے بے نیاز
گردشِ حالات کی شدت سے ڈرنا چاہیئے

ذہن جب تاریک ہو جائیں مشینوں کے طفیل
جذبِ دل کی روشنی کو عام کرنا چاہیئے

ہر گھڑی ہیں موت کے سائے تعاقب میں سحرؔ
یہ اگر جینا ہے تو بے خوف مرنا چاہیئے

سورج نہیں زمین نہیں آدمی نہیں
مَیں اس مقام پر ہوں جہاں کوئی بھی نہیں

دیکھے ہوئے ہیں ہم نے دھنک کے تمام رنگ
منظر کوئی ہمارے لئے اجنبی نہیں

صحرا کی سمت جایئے کیوں شہر چھوڑ کر
ویرانیوں کی دل کے نگر میں کمی نہیں

فرصت ملے تو گوشۂ دل کی سیر کر
اس بحر کی کسی کو ابھی تہہ ملی نہیں

ہے نور ہی کا سایہ سحرؔ خود یہ تیرگی
وہ کون سی جگہ ہے جہاں روشنی نہیں

قریۂ دل عالمِ احساس میں کیا کیا ہوا
خاک تھا لیکن کبھی صحرا کبھی دریا ہوا

خلوتوں میں بھی اسے احساسِ تنہائی نہ تھا
دل سراپا انجمن تھا انجمن آرا ہوا

شام کے سورج کا نظارہ بھی کیا دلدوز ہے
شاخِ گردوں پر ہے کوئی پھول مرجھایا ہوا

مَیں ہی زندانِ مشیت میں اسیرِ غم نہیں
وقت کا چہرہ بھی ہے کچھ غم سے سنوَلایا ہوا

یہ بھی شاید ایک بے منزل مسافر ہے سحرؔ
دل جو اک پتا سا دشتِ غم میں ہے اُڑتا ہوا

چمکا ہے داغ بن کر ردائے خیال پر
وہ پھول جو کڑھا ہے تری سرخ شال پر

تخاطب

شاید یہی ہے شدتِ احساس کا مقام
پتھر کا خون تیر رہا ہے کدال پر

اس کے لطیف جسم کی مہکار کے لئے
دل مطمئن نہیں ہے گلوں کی مثال پر

چہروں کے ازدحام سے فرصت اگر ملی
لکھوں گا ایک نظم ترے خد و خال پر

کرنوں کے تیز تیر برستے رہے سحرؔ
روکے رہا مَیں اپنے ہی سائے کی ڈھال پر

ڈوبتے جسموں کے سب طوفاں بپھر کر رہ گئے
چند بازو تھے جو پانی میں اُبھر کر رہ گئے

کوئی کرنا چاہے بھی یکجا تو اب ممکن نہیں
شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتے بکھر کر رہ گئے

اس قدر راتوں کی تاریکی کے ہم عادی ہوئے
صبح کی پہلی کرن چمکی تو ڈر کر رہ گئے

ان کی قسمت میں کسی منزل کی آسائش نہ تھی
قافلے تھے کچھ جو راہوں سے گزر کر رہ گئے

گھر سے نکلے تھے سحرؔ ہم روشنی کی چاہ میں
تیرگی کے تیر آنکھوں میں اُتر کر رہ گئے

خیال اُس کا دلِ ناشاد رکھنا
گھر اُس کی یاد سے آباد رکھنا

اُسے بے شک سرے سے بھول جانا
پر اپنے آپ کو تو یاد رکھنا

قفس میں گھٹ کے مر جائیں نہ طائر
دِلوں کو درد سے آزاد رکھنا

گُلوں کے خواب تو جی بھر کے دیکھو
مگر اندیشۂ صیاد رکھنا

سحرؔ جب گھر بناؤ حسرتوں کا
نئے انداز کی بنیاد رکھنا

جب غبارِ غم فضائے ذہن پر چھانے لگا
دل کے آئینے میں تیرا عکس دھندلانے لگا

آنکھ تو بے منظری کے خوف سے پتھرا گئی
بے یقینی کی خزاں میں دل بھی مرجھانے لگا

تجھ سے اس دل کو تھی کتنی غمگساری کی اُمید
تو بھی میرا قصۂ غم سُن کے اُکتانے لگا

میرے رستے میں کسی کی زُلف کا سایہ بھی ہے
کس لئے مَیں دھوپ کے صحرا میں سستانے لگا؟

شہر میں وہ بے حسی کا زہر برسا ہے سحر
دیکھتے ہی دیکھتے ہر شخص پتھرانے لگا

خزاں کے دورِ ستم کی نشانیوں میں نہیں
ہوا کا ذکر گُلوں کی کہانیوں میں نہیں

کسی کی شبنمی آنکھوں میں کر تلاش اس کو
گہر وہ بھید ہے جو گہرے پانیوں میں نہیں

گئے دنوں کا عذاب آ گیا ہے یوں سر پر
کہ جیسے وقت کی کشتی روانیوں میں نہیں

ستم گری میں تو اس کا جواب مشکل ہے
اگرچہ رسمِ ستم کے وہ بانیوں میں نہیں

ہمارے عشق کا قصہ بہت نیا ہے سحر
سراغ اس کا پرانی کہانیوں میں نہیں

ہونٹ چپ ہوں مگر آنکھ تر چاہیئے
بات کرنے کا ایسا ہنر چاہیئے

آسماں کی بلندی ہے زیرِ قدم
اپنی ہستی کی بھی کچھ خبر چاہیئے

روشنی کی حقیقت کا عرفان ہو
میرے مالک مجھے وہ نظر چاہیئے

محبسِ دل کی تاریکیاں اَلاماں!
ایسی دیوار میں ایک در چاہیئے

مجھ کو لفظوں کے مفہوم سے ہے غرض
جوہری کو تو آبِ گہر چاہیئے

کتنی خاموش و تاریک ہے یہ فضا
دشتِ دل میں طلوعِ سحر چاہیئے

تخاطب

دل کے داغوں کو جلائے رکھنا
لَو چراغوں کی بڑھائے رکھنا

جس قدر اشک بہیں اچھا ہے
ان خزانوں کو لٹائے رکھنا

تم اکیلے ہو تو کیا؟ یادوں کا
دل میں اِک شہر بسائے رکھنا

ہم اُسے یاد کئے جاتے ہیں
جس کی عادت ہے بھلائے رکھنا

جاگنے کا بھی یہی مطلب ہے
آنکھ میں خواب سجائے رکھنا

بے یقینی کے اندھیروں میں سحر
درد کی جوت جگائے رکھنا

اشکوں کو غم کی آگ سے تر کر رہا ہوں مَیں
پانی کی بوند بوند گہر کر رہا ہوں مَیں

مَیں روشنی کا جسم ہوں، مَیں روشنی کی جاں
سورج کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا ہوں مَیں

چہرہ کوئی تو ہو جو مجھے میرا عکس دے
بے آب آئنوں پہ نظر کر رہا ہوں مَیں

چمکا ہے بن کے سیپ کا موتی مرا ہر اشک
چپکے سے اس کی آنکھ میں گھر کر رہا ہوں مَیں

اس انتظار میں کہ کبھی ہو گی روشنی
اپنی شبِ حیات سحر کر رہا ہوں مَیں

دھڑک رہا ہوں تری روح میں بُھلا نہ مجھے
مَیں لوحِ دل پہ تری نقش ہوں مِٹا نہ مجھے

جو کھو گیا تو نہ پھر عمر بھر ملوں شاید
مَیں ایک گوہرِ نایاب ہوں گنوا نہ مجھے

مَیں تیری بھیگتی پلکوں پہ اِک ستارہ ہوں
جو ہو سکے تو ابھی خاک میں مِلا نہ مجھے

مَیں یادگار ہوں گزری ہوئی بہاروں کی
زمیں پہ اے شجرِ زندگی! گرا نہ مجھے

کوئی کلی کہیں چٹکی تو دل میں ہُوک اُٹھی
ملا ہے شدتِ احساس کا خزانہ مجھے

اُمیدِ صبح ہے زندہ مرے ہی دم سے سحؔر
چراغِ شامِ الم ہوں ابھی بُجھا نہ مجھے

چاہیئے اپنے ہی دشمن کا سہارا مجھ کو
گردشیں یہ بھی دکھائیں گی نظارا مجھ کو

شام کی تیرگی میں ایک ستارہ چمکا
اجنبی شہر میں یہ کس نے پکارا مجھ کو

سائے جسموں سے گریزاں سے نظر آتے ہیں
کس زمیں پر مرے مالک نے اُتارا مجھ کو

اب مَیں ہر مرحلۂ غم سے گزر جاؤں گا
مِل گیا آپ کی آنکھوں کا اشارہ مجھ کو

دوستوں کے جو کرم کا ہے یہی حال سحؔر
دشمنوں کا ہے ہر اِک ظلم گوارا مجھ کو

نظر سے چھپ رہا ہے ماہتاب آہستہ آہستہ
بکھر جائے نہ سارا شہرِ خواب آہستہ آہستہ

رچے گی رفتہ رفتہ پیار کی خوشبو فضاؤں میں
کھلیں گے تیرے ہونٹوں کے گلاب آہستہ آہستہ

ترے چہرے کا اِک اِک نقش دنیائے معانی ہے
پڑھوں گا مَیں یہ سربستہ کتاب آہستہ آہستہ

خیال اُس آئینہ پیکر کا دل سے یوں ہوا رخصت
اُفق میں جیسے ڈوبے آفتاب آہستہ آہستہ

سحر ہرگز پریشاں ہو نہ اشکوں کی روانی سے
اتر ہی جائے گا یہ سیلِ آب آہستہ آہستہ

کبھی دھنک کبھی سورج کے قید خانوں میں
زمیں کی خاک بھٹکتی ہے آسمانوں میں

فصیلِ دل کو سیاہِ خیال نے گھیرا
یہ شہر چُھپ گیا بادل کے سائبانوں میں

گلوں کے رقص میں آنے کا وقت ہے لیکن
خزاں کا رنگ جھلکتا ہے آشیانوں میں

دُھواں اُگلتی ہوئی چمنیاں یہ کہتی ہیں
حیات روز سُلگتی ہے کارخانوں میں

ازل سے تازہ رہا ہے سحر فسانۂ دل
اگرچہ لکھا گیا مختلف زبانوں میں

چاند ڈوبا تو اندھیروں کو برستے دیکھا
برف پگھلی تو ہر اِک سمت اُجالا پھیلا

رات آکاش پہ ایک ایک ستارا رویا
کاش مَیں روشنیٔ غم کا مقدر ہوتا

تیرگی حد سے بڑھی جب ستمِ دوراں کی
اُفقِ دل پہ تری یاد کا سورج اُبھرا

ساری پیچیدگیاں ختم ہوئیں گلیوں کی
اک دریچے سے کوئی شوخ ستارہ جھانکا

دل کے جنگل میں دھنک اُبھری سحر یادوں کی
شام ہوتے ہی خیالات کا منظر بدلا

آنکھ میں گر روشنی کا وہ حسیں پیکر نہ ہو
ظلمتِ شب کی خطر سے پُر مہم یوں سر نہ ہو

میری آوازوں کا اس پر کچھ اثر ہوتا نہیں
مَیں جسے انساں سمجھتا ہوں کہیں پتھر نہ ہو

گوشے گوشے میں ہے رنگا رنگ خوابوں کی دھنک
ذہن بھی اس کے خیالوں کا عجائب گھر نہ ہو

آسماں کے لب پہ اُبھری ہیں شفق کی سُرخیاں
صُبح کہتے ہو جسے وہ شام کا منظر نہ ہو

کیسے ممکن ہے سحر تخلیقِ فن کا مرحلہ؟
درد جب تک آدمی کی روح کے اندر نہ ہو

بھول کر تو نے دریچے سے جو دیکھا ہوتا
تپتا سورج تری دیوار کا سایہ ہوتا

ایک مدت سے ہے دل رنج و محن سے خالی
اس سرائے میں مسافر کوئی اترا ہوتا

اے خیالِ رخِ جاناں! ترا ممنوں ہوں مَیں
تُو اگر ساتھ نہ دیتا تو مَیں تنہا ہوتا

آنکھ کھولی تو فسوں ٹوٹ گیا رنگوں کا
کاش خوابوں ہی میں اس شخص کو دیکھا ہوتا

ہم بھی کہتے غمِ ہجراں کا سحر افسانہ
اس نے گر حال ہمارا کبھی پوچھا ہوتا

دیوار تھی نہ بام نہ در یاد ہے مجھے
اپنا تھا ایک دشت میں گھر یاد ہے مجھے

بچھڑے ہوئے اگرچہ زمانہ گزر گیا
اب تک جُھکی جُھکی وہ نظر یاد ہے مجھے

اب عُمر شاخِ زرد کی صورت ہے بے ثمر
کیسا ہرا بھرا تھا شجر یاد ہے مجھے

بے آب ہوگئی ہیں اب آنکھوں کی سیپیاں
ان سیپیوں میں کیا تھے گہر یاد ہے مجھے

منزل پہ آ کے بھول گئے سب صعوبتیں
کیسی تھی ابتدائے سفر یاد ہے مجھے

سورج کی ایک ایک کرن جب اُداس تھی
وہ منظرِ طلوعِ سحر یاد ہے مجھے

شامِ الم سے صبحِ خوشی کچھ کہتی ہے
تیز ہوا سے کلی کلی کچھ کہتی ہے

کان لگائے رکھنا بپھری لہروں پر
ڈوبنے والی ہر کشتی کچھ کہتی ہے

بادِ صبا کے نرم اور نازک جھونکوں سے
کلیوں کی معصوم ہنسی کچھ کہتی ہے

شہروں کا بھی مستقبل محفوظ نہیں
ہر اُجڑی ویراں بستی کچھ کہتی ہے

شام کی آہٹ پر مت دینا دھیان سحرؔ
شام کبھی کچھ اور کبھی کچھ کہتی ہے

❁

موڑ دے رُخ کوئی بہتے ہوئے دریاؤں کا
فاصلہ بڑھتا چلا جاتا ہے صحراؤں کا

اس قدر شور ہے آواز کوئی صاف نہیں
دل میں محشر سا بپا ہے کئی دنیاؤں کا

تخاطب

جب سے تُو شہر کی پُر شور فضا میں گم ہے
کتنا سنسان ہے ماحول ترے گاؤں کا

پاؤں زخمی ہیں مگر بڑھتے چلے جاتے ہیں
حوصلہ دیکھے کوئی بادیہ پیماؤں کا

دلِ تنہا پہ قیامت سی گزرتی ہے سحرؔ
ذکر چھڑ جائے اگر انجمن آراؤں کا

❁

سرد خموش اندھیرا ہر سُو پھیل گیا
کالی رات کا کالا جادو پھیل گیا

دل میں تیری یاد کا چاند چمک اٹھا
پلکوں پر آوارہ آنسو پھیل گیا

زلف کسی رنگیں چہرے پہ لہرائی
ابر سرِ شہر رنگ و بُو پھیل گیا

کیسے اپنائیں غم کے افسانے کو؟
یہ افسانہ بھی تو ہر سُو پھیل گیا

کانٹوں کی فریاد رہی محدود سحؔر
پھول کا نغمہ بن کر خوشبو پھیل گیا

کل تک تھی حسیں شہر کی پُر شور فضا بھی
اب دل پہ گزرتی ہے گراں اپنی صدا بھی

بخشے ہیں شعاعوں نے وہ تاریک اُجالے
آنکھوں میں کھٹکتی ہے ستاروں کی ضیا بھی

تخاطب

آئینے کی آنکھوں سے بھلا کون چھپا ہے؟
تو عکس ہے میرا تو مرے سامنے آ بھی

وہ حبس ہے خوشبو کا بدن ٹوٹ رہا ہے
پھولوں کو میسر ہے کہاں موجِ ہوا بھی

سایہ بھی سحؔر میرے تعاقب میں نہیں اب
سُورج نے مٹائے مرے نقشِ کفِ پا بھی

صدیوں خلوصِ ذہن سے سوچا گیا مجھے
تب لوحِ کائنات پہ لکھا گیا مجھے

لمحہ وہ اوّلین مری زندگی کا تھا
زنجیرِ خواہشات جو پہنا گیا مجھے

کس درجہ میرے ذہن پہ چھایا ہوا ہے وہ
اُس کو بھلانا چاہا تو یاد آ گیا مجھے

سوچا تو درد پھیل گیا دل کے آس پاس
دیکھا اُسے تو اور بھی تڑپا گیا مجھے

برفاب ہو چکے تھے مرے جسم و جاں سحرؔ
اُس کا خیال آیا تو گرما گیا مجھے

حُسن میں ڈوبے ہوئے رنگیں نظاروں میں نہیں
گلستانِ دل کی کیفیت بہاروں میں نہیں

درد کی لذت سے ہیں محروم اہلِ آسماں
روشنی کا اصل پر تو چاند تاروں میں نہیں

تخاطب

جو نگاہوں کے حسیں اظہار کی صورت میں ہے
وہ فصاحت وہ بلاغت استعاروں میں نہیں

کشتیٔ دل کے مسافر پر ہوا ہے انکشاف
جو سکوں طوفان میں ہے وہ کناروں میں نہیں

کر دیا سب پر عیاں جو درد تھا میرا سحرؔ
راز سے واقف ہوں لیکن رازداروں میں نہیں

کوئی بھی روزنِ گردوں نظر نہیں آتا
مجھے تو شب کا یہ افسوں نظر نہیں آتا

جو سوچیے تو ستاروں کا قتل جاری ہے
جو دیکھیے تو یہ شب خوں نظر نہیں آتا

وہ تیرگی ہے کہ ہر ذرہ ٹمٹماتا ہے
وہ روشنی ہے کہ گردوں نظر نہیں آتا

مرے وجود کی بے تاب روشنی کے لئے
یہ خاکداں مجھے موزوں نظر نہیں آتا

گر اس کا چہرہ ہے شفاف آئینے کی طرح
تو میرا عکس مجھے کیوں نظر نہیں آتا؟

بھلائیں بھی تو اُنہیں کس طرح بھلائیں سحرؔ؟
کتابِ دل میں یہ مضموں نظر نہیں آتا

❁

شب کی ظلمت گر افق کی لوح سے چھٹ جائے گی
دن کی پیشانی غموں کی گرد سے اٹ جائے گی

روح کے زخموں کی شادابی کہاں ہے مستقل؟
ایک دن یہ لہلہاتی فصل بھی کٹ جائے گی

وہ بھی دن آئے گا جب بجھتے ہوئے دیپک کی لو
سخت طوفانِ ہوا کے سامنے ڈٹ جائے گی

روح میری جسم کے زنداں میں ہے تو کیا ہوا
پتھروں میں لعل کی قیمت بھلا گھٹ جائے گی؟

مَیں شعاعوں کے لباسِ نَو میں نکلا ہوں سحرؔ
میرے رستے کی ہر اِک دیوار خود ہٹ جائے گی

❁

موسم کی نیت پہچان کے نکلا ہوں
ساتھ ہوا کے تیر کمان کے نکلا ہوں

سایوں کی بارش سے بچنے کی خاطر
گھر سے دھوپ کی چھتری تان کے نکلا ہوں

دیتا ہے جو دیس میں بھی روزی سب کو
باہر اس کو رازق مان کے نکلا ہوں

جیت بھی ہو سکتی ہے ہار بھی ممکن ہے
میداں میں یہ سب کچھ جان کے نکلا ہوں

میرا نام ہے قلب و ذہن کا کربِ سحرؔ
جنت سے مَیں ساتھ انسان کے نکلا ہوں